اسلام میں حکومت کا تصور

از جناب محمد آصف صاحب سیوہاروی بی۔ اے

آغازِ انسانیت سے لیکر آج تک کوئی زمانہ ایسا نہیں گزرا جس میں کسی رنگ اور کسی طرز کی حکومت کسی حصۂ زمین پر نہ رہی ہو۔ سیاسی مفکروں میں اگرچہ حکومت کی پیدائش کے سلسلہ میں بہت کچھ اختلاف ہے لیکن اب یہ بات ثابت ہوگئی ہے کہ انسان ہمیشہ کسی نہ کسی حکومت کے ماتحت رہا ہے اس میں شک نہیں کہ حکومت کی تعریف وقت اور زمانہ کے اعتبار سے مختلف رہی ہے لیکن بعض شرائط جو اداروں کو حکومت کہلائے جانے میں مُمِدّ و معاون ہوتی ہیں، قدیم سوسائٹی میں بھی پائی جاتی ہیں۔ اگرچہ افلاطون کا یہ خیال "کہ کنبہ اور حکومت میں صرف وسعت کا فرق ہے" زیادہ صحیح نہیں ہے پھر بھی کنبہ اور حکومت میں بعض اہم جز مشترک پائے جاتے ہیں اور کنبہ بڑی حد تک موجودہ حکومت کی تشکیل میں معاون رہا ہے، کنبہ داری سے قبل کی سوسائٹی یقیناً آغازِ انسانیت سے قبل کی سوسائٹی قرار پائیگی اور اس لئے اس دور میں کسی قسم کی حکومت کا تصور نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ ارسطو کا قول "انسان مل جل کر رہنے والا جانور ہے وہ کبھی بغیر سوسائٹی کے نہیں رہا" یہ بھی ہمارے خیال میں آغاز انسانیت سے متعلق ہے۔

اس وقت دنیا میں جو سیاسی اضطراب اور بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے جہاں اور بہت سے اسباب ہیں ایک اہم سبب حکومت سے عوام کی ناواقفیت بھی ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ موجودہ زمانہ میں حکومت کے جو ڈھانچے پائے جاتے ہیں۔ وہ کسی نے ایک دن میں بنا کر نہیں کھڑے کر دیئے بلکہ حکومت بھی اور چیزوں کی طرح ارتقائی منزلوں سے گزرتی رہی ہے۔ روم اور یونان کی معروف العوام حکومتوں سے لے کر موجودہ دور کی حکومتوں تک ان میں سینکڑوں تبدیلیاں ظہور پذیر

ہوئیں اور حکومت بے شمار انقلابی وادیوں کو طے کر کے اور "ہفت صد ہفتاد قالب" دیکھکر موجودہ منزل تک پہنچی ہے۔ اس زمانہ میں حکومت کی مختلف النوع اشکال اور نت نئے نظریوں کے سامنے انسان مبہوت ہو کر رہ جاتا ہے اور جب تک حکومت کے بارے میں اس کو کافی وشافی علم نہ ہو وہ اپنے خیالات کو ایک مرکز پر جمع نہیں کر سکتا۔

اہلِ یورپ میں تو بہت پہلے سے ایک گروہ جمہوریت سے بدظن تھا اور اسی گروہ نے مل کر "نازی" "فاشیٹ" "کمیونسٹ" حکومتوں کی بنا ڈالی۔ مگر اب ہندوستان بھی جس کی معراج کبھی صرف جمہوری حکومت حاصل کرنا تھا اسوقت جمہوریت سے بدظن ہے اور یہاں کے باشندوں کی ایک کثیر تعداد جمہوریت کے نوزائیدہ پودہ کی بیخ کنی پر آمادہ نظر آتی ہے۔ یہ سوال کہ کونسی جماعت راہ راست پر ہے اس کا جواب آسان نہیں۔ ایسے لوگ بہت کم ہیں جو کسی اصول کے ماتحت رائے قائم کرتے ہیں۔ عوام حکومت کی بھول بھلیاں سے ناواقف ہیں وہ ہر شعلہ پر شمع کا گمان کر کے پروانہ وار اس کا طواف شروع کر دیتے ہیں۔ مسلمانوں کی حالت اور بھی قابلِ افسوس ہے۔ ان میں ایک بہت بڑا طبقہ یہ یقین کر بیٹھا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ختم ہو جانے سے اسلامی اصول بھی فنا ہو گئے۔ وہ مغربی مورخین کی ساحرانہ تحریروں کے زیر اثر یورپ سے ایسے مرعوب و مسخر ہو گئے کہ کسی اسلامی ادارہ کی طرف توجہ کرنا جہالت کا مترادف سمجھتے ہیں۔ تاریخ سیاست میں تو ان کا سرے سے نام ہی نہیں۔ مفکرینِ یورپ میں جہاں کسی مفکر نے یہ کہا کہ مسلمانی حکومتیں صرف دینی حکومتیں (Theocracy) تھیں۔ مغرب زدہ سادہ لوح مسلمان بھی یہ سمجھنے لگا کہ سیاست کی اندھیریوں کے لئے خضرِ راہ مغرب کے علاوہ کوئی نہیں۔ ایسا گمان رکھنے والوں سے ہماری گذارش ہے ؎

سخن شناس نئی دلبرا خطا ایں جاست

حکومت کی تعریف اس تمہید کے بعد اب ہم اس موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔ حکومت وہ سیاسی نظام ہے۔ جس کے ذریعہ ریاست اپنے احکام جاری کرتی ہے یا جیسے فرانسس لیبر

(Francis Leeber) نے کہا ہے کہ حکومت وہ آلہ یا کل ہے جس کے ذریعہ ریاست ہر اس موقع پر کام کرتی ہے جب وہ براہِ راست اپنے اقتدار کو کام میں نہیں لاتی۔

حکومت کے اقسام | حکومت کی قسموں کے متعلق بہت سے اختلافات موجود ہیں اور سیاسی مفکروں نے مختلف اصول کے ماتحت اس کی مختلف قسمیں قرار دی ہیں۔ بعض مفکر تقسیم کا اصول ان آدمیوں کی تعداد قرار دیتے ہیں جن کے ہاتھوں میں اقتدارِ اعلیٰ ہو۔ اس اصول کے ماتحت حکومت کی تین قسمیں کی گئیں ہیں۔

(۱) سلطانی یا شخصی حکومت . . . . . (Monarchical)

(۲) اشرافی۔ . . . . . (Aristocratic)

(۳) جمہوری۔ . . . . . (Democratic)

اگر سرکاری اقتدارِ اعلیٰ کسی ایک شخص کے ہاتھ میں ہے قطع نظر اس سے کہ اس کے ماتحت کتنے افسر کام کرتے ہیں تو طرزِ حکومت شخصی کہلائے گا۔ اس سلسلہ میں عام کسوٹی یہ سمجھی جاتی ہے کہ اگر کسی حکومت کا حکمران سلطنت پر حقِ وراثت سے حکمرانی کرتا ہے تو وہ حکومت شخصی کہلائے گی۔ لیکن حکومت کی یہ تقسیم ارسطو کے زمانہ کی ہے۔ موجودہ زمانہ میں حکومت کا طریقہ اس قدر بدل گیا ہے اور اتنے جدید طرز پیدا ہو گئے ہیں کہ ان کو کسی ایک عنوان کے ماتحت ملانا دشوار ہے۔

مثال کے طور پر انگلستان کی حکومت کو لیجئے جس میں بادشاہت سلسلہ بہ سلسلہ ایک ہی خاندان میں چلی آتی ہے اور حکمران صرف اس حق سے فرمانروائی کرتا ہے کہ اس سے قبل اس کا باپ حکومت کرتا تھا، انگلستان کے نامکمل آئین کے مطابق بادشاہ قانون کا سرچشمہ ہے حکومت اس کی حکومت ہے۔ وزارتیں اس کے وزرا ہیں۔ عدالتیں اس کی عدالتیں ہیں اور وہ خود قانون کے بالا و مبرا ہے۔ انگریزی ضرب المثل کہ "بادشاہ کوئی جرم نہیں کر سکتا" بھی اسی لئے ہے کہ بادشاہ قانون کا منبع ہے اور اس لئے قانون سے بالاتر ہے۔ مگر یہ سب کچھ ایک کیمیائی نمود کے سوا

کچھ نہیں۔ حقیقت میں بادشاہ کو کوئی اختیار نہیں اور تمام اختیارات وزیر اعظم بادشاہ کے نام پر استعمال کرتا ہے۔ بادشاہ محض ایک کٹھ پتلی سے زیادہ حقیقت نہیں رکھتا۔ ایسے موقع پر قدیم تعلیم کی حقیقی دقت محسوس ہوتی ہے بہ اعتبار صورت انگلستان کی حکومت شخصی حکومت ہے اور بہ اعتبار روح جمہوری۔ اور یہ مسئلہ اس سے بھی زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے اگر امریکہ، روس، جرمنی وغیرہ حکومتوں پر قیاس کیا جائے۔ بہر نوع جن اصولِ تقسیم کا ذکر ہم اوپر کر آئے ہیں۔ اس کے لحاظ سے ہر وہ حکومت جس میں ایک شخص کو سرکاری اقتدارِ اعلیٰ حاصل ہے اور وہ حق وراثت سے گدی کا مالک بنا ہے اور تخت سلطنت پر تا زیست قایم رہنے کا حق رکھتا ہے۔ وہ حکومت شخصی کہلائے گی۔ اور اگر سرکاری اقتدارِ اعلیٰ چند انسانوں یا آبادی کی ایک مختصر جماعت کے ہاتھ میں ہو تو حکومت اشرافی کہلائے گی۔ اس طرزِ حکومت میں آبادی کی اقلیت، اکثریت پر حکمرانی کرتی ہے لیکن اگر آبادی کی اکثریت کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہے اور سرکاری اقتدارِ اعلیٰ میں ایک کثیر تعداد حصہ دار ہے، خواہ شرکت نمایندہ جماعت کے ذریعہ سے ہو، تو ایسی حکومت جمہوری حکومت کہلاتی ہے۔

حکومت کی یہ تقسیم بہت پرانی ہے اور اس دور میں اس کی اہمیت تقریباً فنا ہو گئی ہے کسی حکومت کے متعلق محض اتنی بات کہنے سے کہ وہ شخصی یا اشرافی حکومت ہے، حکومت کی بناوٹ اور اس کے عملی طریقے کی وضاحت نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے حکومت کے مقاصد پر روشنی پڑتی ہے۔ اس تقسیم کے ماتحت حکومتہائے انگلستان، روس اور ترکی سب ایک خانہ میں آجاتی ہیں۔ حالانکہ یہ امر کہ یہ حکومتیں ایک دوسرے کی ضد ہیں محتاجِ بیان نہیں۔ اسی طرح فرانس اور امریکہ ایک ہی قسم کی حکومت کے ماتحت منقسم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ غرض کہ یہ تقسیم اس زمانہ میں ناقص بھی ہے اور غیر مفید بھی۔

اسی طرح دوسرے لوگوں نے حکومت کی تقسیم کی ہے۔ مان ٹسکیو (Montesquie) نے حکومت کی تین قسمیں قرار دی ہیں (Republics.) حکومت جمہوریہ (۲) شخصی حکومت

(۳) حکومت خود مختاری۔ جمہوری حکومت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے "حکومت جمہوریہ وہ حکومت ہے جس میں کل جماعت یا آبادی کا ایک حصہ اقتدارِ اعلیٰ کا مالک ہو"۔ حکومت خود مختاری وہ ہے جس میں ایک انسان اپنی مرضی سے تمام نظم ونسق کرے۔ یہاں اصولِ تقسیم ضروری طور پر تعداد ہے اور جزوی طور پر طرز و منشائے حکومت ہے۔

وولزلے (Woolsly.) نے حکومت کی چار قسمیں لکھی ہیں (۱) شہنشاہیت (Monarchy) (۲) اشرافیہ (Aristocracy) (۳) جمہوریہ (Democracy) (۴) مخلوط ریاست (Compound State) اسی طرح مختلف مفکرین نے مختلف قسمیں کی ہیں۔ نیز ان مفکروں میں اصطلاحات کی تطبیق کے سلسلہ میں بہت کچھ اختلاف ہے۔

اس تقسیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ کوئی تقسیم کسی جامع اصول کے ماتحت نہیں۔ ان میں سے کسی تقسیم کو بھی ہم کسوٹی بنا کر دنیا کی حکومتوں کو نہیں پرکھ سکتے۔ ہر شخص نے اپنے نظریہ کے مطابق علیحدہ علیحدہ تقسیم کی ہے۔ اتنے ہی اصول ہیں جتنے کہ مفکر۔ اور نہ ان نظریوں کے اندر کوئی جامع اصول مشترک ہے۔ ان میں سے کوئی نظریہ ایسا نہیں جس سے فی الواقع مختلف حکومتوں کے مابین امتیاز قائم کیا جا سکے۔

ساخت اور طرز و منشائے حکومت کے لحاظ سے علیحدہ علیحدہ تقسیم کے سوا چارہ نہیں۔ بعض حکومتیں بناوٹ کے لحاظ سے یکساں ہیں مگر ان کا طرزِ حکومت بالکل جداگانہ ہے اس لئے جو تقسیم اپنے قالب اور ساخت کے لحاظ سے ہوگی۔ وہ طرزِ حکومت پر ٹھیک نہیں اتر سکتی۔ اسی بنا پر مختلف حیثیتوں سے حکومتوں کی تقسیم کی جا سکتی ہے۔ اور یہ بحث اس قدر طویل ہے کہ اس پر خود ایک بسیط مقالہ لکھا جا سکتا ہے۔ یہاں ہمیں صرف دیکھنا یہ ہے کہ جتنی حکومتیں اب تک دنیا میں قائم ہوئیں ان کا کیا منشاء تھا اور مفکروں کی حکومت کے بارے میں کیا رائے ہے اور بہترین حکومت کس حکومت کو کہا جا سکتا ہے

مشہور و معروف شاعر پوپ نے بہت ہی چبھتی ہوئی بات کہی ہے۔

"For Forms of Gauernment let fools Contest
That which is best administered is best."

"یعنی اقسام حکومت کے بارے میں بیوقوفوں کو جھگڑنے دو۔ جو حکومت بہتر طریقہ پر انتظام وانصرام کرتی ہے وہی بہترین ہے"

اگرچہ سیاسی مفکروں کے لئے یہ بات تشفی بخش نہیں ہوسکتی مگر اس سے یہ اصول ضرور نکلتا ہے کہ حکومت کی ظاہری ساخت اتنی اہم نہیں جتنا اہم طرز ومنشائے حکومت ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حکومتیں دو ہی طرح کی ہوسکتی ہیں۔ ایک وہ جو چند یا کسی ایک شخص کے احکام کا آلۂ کار ہوں اور دوسری وہ جس میں ہر انسان حکومت کے بارے میں مساوی حقوق رکھتا ہو، ہر شخص اپنے حقوق کا استعمال کرے یا نہ کرے یہ ایک علیحدہ سوال ہے۔ بحث صرف اس پر ہے کہ ہر شخص کو حکومت میں دخل دینے کا حق حاصل ہو۔ خواہ اس کی رائے کی پذیرائی ہوسکے یا نہ ہوسکے۔ حکومت کی بنیاد آبادی پر قائم ہے۔ اور آبادی کے تحفظ اور آسائش وراحت پر حکومت کی تعمیر ہوتی ہے۔ آبادی ہی ملکر حکومت بناتی ہے اور آبادی ہی کی فلاح وبہبود حکومت کا مطمح نظر ہوتا ہے۔ پس اگر تمام آبادی حکومت میں برابر کی حصہ دار ہے تو حکومت انصاف پر مبنی ہے۔ اگر کوئی شخص یا جماعت اپنے اقتدار ومنفعت کے لئے حکومت کرتی ہے تو وہ ظالم ہے۔ شخصی حکومت میں بھی جمہوریت قائم رہتی ہے جیسے امریکہ میں اور اشرافی حکومت میں بھی جیسے سوئزرلینڈ میں جہاں وزرا کی ایک جماعت مل کر حکومت کرتی ہے اور شہنشائیت میں بھی جیسا کہ انگلستان کا طرزِ حکومت ہے۔ منصفانہ اور غیر منصفانہ حکومت کی سیکڑوں قسمیں ہوسکتی ہیں، بالکل اسی طرح جس طرح بناوٹ کے لحاظ سے بہت سی قسمیں ہوسکتی ہیں۔ منصفانہ حکومتوں کے تحت تمام وہ شخصی، اشرافی، جمہوریتیں، صدارتی، ری پبلک اور دینی حکومتیں آجاتی ہیں جن کی بنیاد آبادی کے مساوی حقوق پر قائم ہو۔ اسی طرح غیر منصفانہ حکومت کے تحت تمام وہ حکومتیں آجاتی ہیں جن میں آبادی کے ساتھ ناانصافی برتی جائے۔

لفظِ مساوات بہت سے غلط معنوں کا حامل ہے اس لئے اس لفظ کا محلِ استعمال اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے۔ کیونکہ یہ اس جگہ ایک خاص معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے۔ مساوات، مراد مساوی حقوق سے ہے یعنی ہر شخص کو بغیر خوف وخطر حکومت پر اعتراضات کرنے کا حق حاصل ہو۔ اس حق کا غلط استعمال

بھی کیا جا سکتا ہے۔ ہر فتنہ پرداز اپنی کام جوئیوں کی تلقین کو اپنا حق بتا سکتا ہے۔ اس بات کا فیصلہ کہ کونسی بات مناسب ہے اور کونسی نامناسب اکثریت کا حق ہے اور اکثریت ہی کی بات قابلِ قبول ہو سکتی ہے، لیکن اسلام میں اکثریت کا تصور ایک آزاد اکثریت کا تصور ہے۔ اگر آبادی اکثریت اور اقلیت میں باقاعدہ طور پر منقسم ہے تو یہ ایک خطرناک قسم کی تقسیم ہے جو آزادی کے منافی ہے۔ موجودہ زمانہ میں جمہوریت جماعتی نظام سے وابستہ ہے۔ اور جماعتی پابندی حکومت کی پابندی سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ ہر جماعت پہلے سے لائحہ عمل بنا لیتی ہے اور اس پر اس شد و مد سے عمل پیرا ہوتی ہے کہ کسی فرد کو اس کے خلاف آواز بلند کرنے کی جرأت نہیں ہو سکتی اور بالفرض اگر کسی نے اس کی جرأت کی بھی تو فوراً اس کو جماعت سے برطرف کر دیا جاتا ہے۔ [1]

دوسری بات جو اسلام میں سب سے زیادہ نمایاں اور دوسری قسم کی حکومتوں سے بہر حیثیت مختلف ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں دستورِ اساسی خدا کا بنایا ہوا ہے۔ کسی انسان کا بنایا ہوا نہیں۔ اسلامی دستورِ اساسی (شریعت) غیر متبدل اور ناقابلِ تغیر (Rigid) قانون ہے اور کسی دوسرے دستورِ اساسی سے اس اعتبار سے مختلف ہے کہ کوئی اور دستور اساسی جو اگرچہ ظاہری اعتبار سے بے لوچ اور غیر متبدل معلوم ہوتا ہے جیسے امریکہ کا قانونِ اساسی وہ بھی بعض سخت شرائط کے ماتحت تبدیل ہو سکتا ہے

---

[1] (ہندوستان میں سبھاش چندر بوس سابق صدر کانگریس کی مثال اس کی تصدیق کرتی ہے) پارلیمنٹ کی با اقتدار جماعت وزارت بناتی ہے اور ہر طرح ملک پر مسلط رہتی ہے۔ اگر افراد کی اہم تعداد اس جماعت سے اختلافِ رائے ظاہر کرے تو فوراً وزارت مستعفی ہو جائے۔ برطانوی پارلیمنٹ میں ۳۱ اپریل ۱۹۴۴ء کو مخالف جماعت کی طرف سے ایک ترمیم پیش ہو جانے پر مسٹر چرچل نے اعلان کر دیا تھا کہ اگر حکومت کی تجویز من و عن نہ منظور کی گئی تو وزارت اپنی خدمات واپس لے لے گی۔ گویا اکثریت کو حق حاصل ہے کہ وہ جس طرح چاہے حکومت کرے اور اقلیت زبانی جمع خرچ کے علاوہ اگر کسی معقول بات پر اصرار کرے یہاں تک کہ اقلیت اکثریت میں تبدیل ہو جائے تو یہ وزارت پر بے اعتمادی کا اعلان سمجھا جائے گا۔ اسلامی حکومت کے اندر اسی لئے اس طرح کی منظم جماعتوں کا التزام نہیں ہے۔ بلکہ ہر مسئلہ پر ہر شخص کو آزاد رائے دینے کا پورا حق حاصل ہے۔

اور ہوا ہے مگر اسلامی دستور اساسی اپنی جگہ پر چٹان کی طرح جوں کا توں قائم ہے۔ اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں۔ شریعت ہمیشہ کسی نہ کسی پیغمبر پر نازل ہوئی اور اب ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین اور لا نبی بعدی کے بعد اسلامی شریعت میں کسی تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں۔ دوسرے فرمانِ ربانی الکملت لکم دینکم کے بعد اب کسی تبدیلی کی ضرورت بھی باقی نہیں رہتی۔ اور ان الحکم الا للہ (یوسف) "حکم خدا کے سوا کسی کا حق نہیں" کے بعد انسان کو اس معاملہ میں دم مارنے کا بھی موقع نہیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے "اسلام کا اقتصادی نظام" میں اس اجمال کی تشریح اس طرح بیان فرمائی ہے۔

"اسلام نے جب حریتِ اسلامی کا علم بلند کیا تو سب سے پہلے یہ اعلان کیا کہ اس کے اجتماعی نظام میں حکومت، کارفرمائی اور وضع قانون اساسی کا معاملہ دنیا کے کسی انسان کے ہاتھ میں نہیں ہے، بلکہ حکم صرف خدا کا ہے اور حکمرانی صرف ذاتِ واحد کی ہے۔ وہی واضع قوانین ہے اور اسی کی کارفرمائی سب پر حاوی ہے۔

ملک الناس الہ الناس (الناس) وہ (خدا) انسانوں کا بادشاہ (ہے) انسانوں کا خدا ہے۔

الا لہ الحکم (انعام) خبردار ہو حکم "اسی خدا" کا ہے۔

لیکن اس بات سے یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ خدائے بزرگ و برتر نے انسانوں کو مجبور و معذور کر دیا چونکہ انسانی زندگی کی وسعتوں کا اندازہ لگانا مشکل ہے اس لئے اس کے لئے کوئی قانون ایسا نہیں بنایا جا سکتا جس میں لچک نہ ہو۔ اور اسلام دینِ فطرت ہے اسی لئے اس کے قانون میں معنیٰ کے اعتبار سے اس قدر لچک ہے کہ اس میں انسانی زندگی بالکل سموئی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں قیاس کو مشروع کیا گیا ہے۔

چنانچہ حضرت عمر فاروق رضؓ کی ذات بابرکات نے قضا کے اصول دائمین پر جو فرمان تحریر فرمایا تھا اس میں وضع قانون کے متعلق فرمایا ہے "جس مسئلہ میں شبہ ہو اور قرآن اور حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو۔ اس پر بار بار غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں کو پہچان کر ان پر قیاس کرو۔

کنز العمال میں قضاۃ کو ہدایات کے تحت مذکور ہے کہ حضرت فاروق کا ارشاد تھا "مقدمات میں اول قرآن مجید کے مطابق فیصلہ کرو، اگر قرآن میں وہ صورت مذکور نہ ہو تو حدیث کی طرف رجوع کرو اگر حدیث میں مذکور نہ ہو تو اجماع سے ورنہ اجتہاد سے کام لو۔

آنحضرتؐ نے ان افعال واقوال کے بارے میں جن کا منصب رسالت سے تعلق نہیں ارشاد فرمایا ہے کہ "میں آدمی ہوں اس لئے جب دین کی بابت کچھ حکم دوں تو اس کو لو، اور اپنی رائے سے کچھ کہوں تو میں بھی ایک انسان ہوں (الفاروق ص ۱۹۰)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ نے لشکر کشی وغیرہ کے احکام کو اسی قسم کی رائے پر محمول کیا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ اسلامی قانون اس زمانہ کے لئے مفید تھا اور اب دنیا اتنی آگے بڑھ گئی ہے کہ اسلام کے قدیم قوانین موجودہ ضرورتوں کو پورا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک سطحی بات ہے کیونکہ اسلام کے قوانین فطری احکام ہیں اور فطرت تا قیامت ایک ہی حالت پر رہے گی۔ انسان فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور وہ زیادہ دنوں تک اپنی فطرت کو نہیں جھٹلا سکتا۔

حکومت کی شعبہ وار تقسیم | عام طور پر حکومت کی تقسیم تین حصوں میں کی جاتی ہے۔

۱, Legislative	قانون ساز
۲, Executive	انتظامی
۳, judicial	عدالتی

لیکن یہ تقسیم موجودہ زمانہ کے پیچیدہ نظام کے پیشِ نظر ضرورت سے زیادہ سہل ہے۔ ارسطو نے حسب ذیل تفریق قائم کی تھی۔

۱, Deliberative	بحث یا مشورہ سے متعلق
۲, Magisterial	حاکمانہ
۳, judicial.	عدالتی

اگرچہ یونان کی سابق حکومتوں کے اندر ایک ہی شخص ان تینوں قوتوں کا مالک ہوتا تھا اور ارسطو کا نظریہ

صرف ایک نظریہ تھا جس پر عملدرآمد بالکل نہیں ہوتا تھا۔

(Polybius) پولوبیس اور (Cicero) سسرو نے تعادل و توازن قوت پر بہت زور دیا ہے ان کا خیال تھا کہ ایک قوت دوسری قوت کے اس طرح ماتحت رہے کہ کوئی قوت اپنی حد سے متجاوز ہو کر کام نہ کر سکے۔

موجودہ دور سیاست کا آدم بوڈان ہے اس نے انتظامی اور عدالتی قوتوں کی تفریق پر زور دیا ہے۔ اس کی رائے ہے کہ صاحب حکومت (اس نے لفظ پرنس Prince استعمال کیا ہے) کو خود عدالتی قوت ہاتھ میں نہیں لینی چاہیے اور عدالتی اختیارات ایک آزاد کمیٹی کو دیدیئے جائیں اور تفریق اختیارات ہی انصاف کا واحد ذریعہ ہے فرانسیسی مصنف (Montesque) مانٹیسکیو نے اپنی کتاب (Esprit des Lois) میں جو ۱۷۴۸ء میں شائع ہوئی۔ تفریق اختیارات کے مسئلہ کو اپنا لیا۔ مانٹیسکیو آزادی کو بہت عزت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ اور آزادی کو انسان کا سب سے بڑا جوہر تصور کرتا تھا۔ اسی آزادی کو محفوظ رکھنے کے لئے اس نے تفریق اختیارات کا نظریہ پیش کیا۔ مانٹسکیو کا نظریہ حسب ذیل ہے۔

"جب قانون ساز، اور انتظامی اختیارات ایک ہی فرد یا جماعت میں متحد ہو جائیں تو اس حالت میں کسی قسم کی آزادی نہیں رہتی . . . . . اگر قوتِ فیصلہ اختیارات قانون سازی کے ساتھ مشترک ہو جائے تو رعایا کی زندگی اور آزادی بے باکانہ اور ظالمانہ حکومت کا نشانہ بن جائے گی . . . . . اگر وہ انتظامی اختیارات کے ساتھ مشترک ہو جائے تو منصف ایک جابر کی طرح برتاؤ کر سکتا ہے"

اس نظریہ نے امریکہ کے دستور اساسی اور انقلابی فرانس کو بہت متاثر کیا۔ لیکن یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ مانٹسکیو کا یہ خیال کہ انگلستان کے قانون کا جوہر اور اس کی بقا کا سبب تفریق اختیارات ہے صحیح نہیں تھا۔ اٹھارویں صدی عیسوی میں انگلستان کی حکومت میں تفریق اختیارات نہیں پائی جاتی اور مانٹسکیو نے انگلستان کی حکومت پر غلط تنقید کی اور یہی غلطی انگلستان کے ماہر قانون (Black Stone) بلیک اسٹون سے ہوئی۔ ان دونوں نے انگلستان کے صرف قانون پر نظر کی اور حکومت کے

عمل کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ یہ ایک فاش غلطی تھی۔

اس نظریہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ یہ عدالتی اختیارات کو دیگر اختیارات سے علیحدہ رکھنے کی تلقین کرتا ہے۔ قانون ساز اور انتظامی حکام کو قانون و انصاف میں دخل اندازی سے روکتا ہے (منٹسکیو) کے قول کے مطابق یہ ہر اختیار کے سر پر اپنی تشریح کرنے کی ذمہ داری عاید کرتا ہے۔

(Bodin) بوڈان پہلا شخص ہے جس نے تفریقِ اختیارات کے مسئلہ کو سوچا اور سمجھا۔ بوڈان کی پیدائش ۱۵۳۰ء میں ہوئی۔ اور اس کے بعد جیسا کہ اوپر لکھ چکے ہیں۔ مانٹسکیو نے اس پر قلم اٹھایا لیکن یہ مسئلہ اس دور میں نظریہ سے آگے نہیں بڑھا لیکن ہم کو تعجب ہوتا ہے جب ہم اسلامی تاریخ کی ورق گردانی کرتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ ۶۳۴ء میں حضرت عمر فاروقؓ خلیفہ مقرر ہوئے اور جب ہم اس خلیفہ کے کارناموں پر نظر ڈالتے ہیں تو تاریخ میں یہ الفاظ بھی لکھے ہوئے ملتے ہیں۔ صیغۂ عدالت کے زیر عنوان الفاروق میں مذکور ہے۔

"یہ صیغہ بھی اسلام میں حضرت عمرؓ کی بدولت وجود میں آیا۔ ترقی تمدن کا پہلا دیباچہ یہ ہے کہ صیغۂ عدالت، انتظامی صیغہ سے علیحدہ قائم کیا جائے دنیا میں جہاں جہاں حکومت و سلطنت کے سلسلے قائم ہوئے، مدتوں کے بعد ان دونوں صیغوں میں تفریق ہوئی، لیکن حضرت عمرؓ نے خلافت کے چند ہی روز بعد اس صیغہ کو الگ کر دیا۔"

"شروع میں بعض انتظامی دشواریوں کی وجہ سے کچھ دنوں تک انتظامی اور عدالتی صیغے ایک رہے لیکن جب پورا انظام قائم ہو گیا تو قضا کا محکمہ مستقل کر دیا۔" [1]

ان سطور کی روشنی میں کسی دعوے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ متعصب نگاہوں کے علاوہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اسلامی سیاست ابتدا ہی سے کتنی اونچی تھی اور سیاست کے میدان میں جو کارہائے نمایاں مسلمانوں نے کئے وہ کسی قوم سے نہ ہو سکے۔ ایچ۔ جی۔ ویلز (H.G. Wells.) جیسے پروپیگنڈا کرنے والے مورخ اپنے دل خراش فقروں اور غلط بیانیوں سے مسلمانوں کو سیاست کے بارے میں

---

[1] تاریخ اسلام مولفہ شاہ معین الدین احمد۔

مفلس قرار دے سکتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں :۔

"اہلِ عرب خفیف سی سیاسی صلاحیت رکھتے تھے اور انھیں سیاسی تجربہ بالکل نہیں تھا۔"[1]

مگر صداقت کے دلدادہ "ہر چمکتی ہوئی شے سونا نہیں ہوتی" کہہ کر ان کتابوں کو طاقِ نسیاں میں اٹھا کر رکھ دیتے ہیں اور وہ اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ یہ جنگل کے قانون سے اسلام کی زرین روایات کو مٹانے کی ایک ناکام کوشش ہے۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں بلکہ (Encyclopaedia Britannica.) والوں نے تو سرے سے مشرقی اقوام کو ہی سیاست سے بے بہرہ سمجھ لیا اور وہ سیاست کے میدان میں ان کا کوئی حصہ تسلیم نہیں کرتے۔ چنانچہ کتاب مذکورہ کی گیارہویں جلد میں اقسام حکومت کے زیرِ تحت مذکور ہے۔

"اقسام حکومت کا سوال صرف یورپی اقوام سے متعلق ہے۔ شہنشائیت اشرافیہ اور جمہوریہ کے محاسن و معائب یورپ کی تاریخی حکومتوں کے مظاہرِ محاسن و معائب ہیں۔ سیاسی تاریخ لکھنے والوں کی زبان کی عمومیت ہمیں اس امر سے اندھا نہ کر دے کہ وہ مقابلتہً انسانوں کے ایک قلیل گروہ کے متعلق خیال کر رہے ہیں۔"

سبحان اللہ کیا یاوہ گوئی ہے۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننا اسی کو کہتے ہیں۔ گویا مشرقی اقوام میں اس قسم کی حکومتیں نہ قائم ہوئیں اور نہ مشرق نے ان حکومتوں کے نظریوں میں معاونت کی۔ حضرات بھول جاتے ہیں کہ مشرقی لوگ زیادہ عملی تھے ان میں یہ مباحث کم ہوتے تھے کہ مرغی پہلے پیدا ہوئی یا انڈا۔ وہ انڈا اور مرغی سے برابر استفادہ کرتے تھے۔ لیکن ہاں مثل مشہور ہے کہ چلتی کا نام گاڑی ہے۔ آج یہ لوگ برسرِ اقتدار ہیں جو چاہیں کہیں۔ لیکن لنکن کے الفاظ میں "وہ تمام آدمیوں کو ہمیشہ کیلئے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔"

مسلمانوں کے سیاسی خزانے خطبات اور احکامات کے اندر دفن ہیں۔ یہ لوگ سیاست کو ایک جزوِ زندگی خیال کرتے تھے اور اس لئے اس کو زندگی سے علیحدہ کوئی اور چیز نہیں سمجھتے تھے دوسرے

---

[1] A Short History of the world. P. 164.

اس زمانہ میں مضامین کی یہ سیمیائی تقسیمیں بھی نہیں تھیں۔ پس متلاشیِ حق کو ڈھونڈھنے سے سب کچھ مل سکتا ہے۔ اور حق پر پردہ ڈالنے والوں کو کچھ بھی نہیں دکھائی دے سکتا۔ مثال کے لئے مسئلہ قضا کو لیجئے یورپی تاریخ "رومن امپائر کے دوازدہ گانہ قواعد جو رومیوں کے بڑے مفاخر خیال کئے جاتے ہیں" پیش کرے گی۔ مگر اسلامی تاریخ اس سے زیادہ شاندار احکامات پیش کرتی ہے اور وہ حضرت عمر فاروق رض کا قضا کے اصول و آئین پر ایک فرمان ہے جو آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ گورنرِ کوفہ کے نام لکھا تھا موجودہ زمانہ میں چونکہ حکومت کی باگ ڈور مغربی اقوام کے ہاتھ میں ہے اور مشرقی اقوام پر ایک سکر چھایا ہوا ہے۔ اس لئے مشرق کے بیش بہا خزانے دنیا کے سامنے اس صورت سے نہیں آئے۔ لیکن حق کی جستجو کرنے والوں کے لئے یہ بے بہا موتی ہر وقت چشم براہ ہیں۔

اگرچہ تفریقِ اختیار کے مسئلہ کی صحت سے انکار نہیں کیا جا سکتا مگر اس پر عمل پیرا ہونے میں آج جو دقتیں پیش آ رہی ہیں اس کے پیشِ نظر اس نظریہ کی اہمیت بہت زیادہ باقی نہیں رہتی۔ ۔ ۔ حکومتِ امریکہ جس کا قانونِ ریاستی سب سے زیادہ اس مسئلہ پر زور دیتا ہے وہ بھی پوری طرح اس مسئلہ پر کاربند نہیں ہو سکی۔ چنانچہ بعض کا خیال ہے کہ موجودہ زمانہ میں تفریقِ اختیارات اتنی ضروری نہیں جتنی اختیارات کی ربط دہی اور گرہ بندی ضروری ہے۔ ہر حصہ کو اپنے تئیں پبلک کا ملازم سمجھنا چاہئے اور اس کو ہر ممکن کوشش کرنی چاہئے کہ انتظام و انصرام امور میں مدد کرے۔ چنانچہ ایچ جے لاسکی رقمطراز ہیں:۔

"قانون ساز مجلسیں اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتیں۔ جب تک کہ وہ قانون کے نفاذ میں دخل اندازی کرنے کے نیز بوقت ضرورت ججوں کے فیصلوں کو جو عام طور پر ناقابلِ اطمینان سمجھے جائیں ایکٹ کے ذریعہ مسترد کر دینے کے قابل نہ ہوں۔"

لاسکی کے نقطۂ نظر سے قطع نظر یہ بات ماننی پڑتی ہے کہ تفریقِ اختیارات جہاں کارکردگی و تاثیر بخشی کی حامل ہے وہاں بعض اوقات شبہات اور اندرونی اختلافات کا بھی باعث بنتی ہے۔ ہر اختیار زیادہ سے زیادہ اتنی طاقت کو استعمال کرنے کا خواہشمند اور دوسروں کو اس کے استعمال سے

علیحدہ رکھنا چاہتا ہے۔ فائنر (Finer) کا قول ہے کہ تفریقِ اختیارات کا نظریہ حکومت کو غفلت اور بےچینی کے متضاد حالات میں پھنسا دیتا ہے۔ مگر ان سب کے باوجود یہ تسلیم کرنا ناگزیر ہے کہ انتظامی اور عدالتی اختیارات کا علیحدہ ہونا انصاف کے لئے ضروری ہے۔

(۱) قانون ساز (Legislature.)

جمہوری طرز کی حکومتوں کو اسمبلی۔ پارلیمنٹ وغیرہ بہ الفاظِ دیگر مجلسِ قانون ساز پر بہت ناز ہوتا ہے۔ لیکن یہ قانون ساز مجلسیں بہت زیادہ عمر نہیں رکھتیں (Jenks) جینکس کے قول کے مطابق اگلے زمانہ میں قانون بنائے نہیں جاتے تھے بلکہ منکشف کئے جاتے تھے۔ جب اول اول پارلیمنٹ کا آغاز ہوا تو اس کا مقصد قانون بنانا نہیں تھا بلکہ روپیہ مہیا کرنا اور روپیہ کی منظوری دینا تھا۔ مگر اب قانون ساز مجلسیں ایک خاص اہمیت رکھتی ہیں۔ لیکن یہ سمجھنا غلطی ہوگا کہ جمہوری حکومت میں صرف قانون ساز مجلسیں ہی قانون کا منبع ہیں۔ پروفیسر ہالینڈ (Holland) نے پانچ حسب ذیل ذرائع اور گنوائے ہیں۔

(۱) Customon. Usage رسم ورواج یا دستور

(۲) Religion مذہب

(۳) gndicial decision عدالتی فیصلے و تجاویز

(۴) Scientific Comment-ries سائنس کی تفسیرات

(۵) Equity اصول معدلت (جن سے قانون کی کوتاہی کی اصلاح کی جاتی ہے اور جو عام رواج اور قانون نافذالوقت پر مرجح سمجھا جاتا ہے)۔

لیکن سب سے زیادہ اہم ذریعہ قانون ساز مجلسیں ہیں۔ موجودہ زمانہ میں بھی انتظامی حصہ قانون سازی سے بالکل دست بردار نہیں ہوگیا۔ امریکہ میں صدر جمہوریہ کو بعض اختیارات ہیں جن کو وہ قانون ساز مجلس (Senate) کے ۲/۳ ممبران کی منظوری کے تحت استعمال کرتا ہے۔ برطانیہ میں پارلیمنٹ صرف قانون کا خاکہ تیار کرتی ہے۔ ان خاکوں کی تفصیلات انتظامی حصہ کے مختلف

محکمے اپنے احکامات سے بناتے ہیں جن میں سے بعض تفصیلات وقتی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ہوتی ہیں اور جن کے لئے پارلیمنٹ کی منظوری ضروری ہوتی ہے۔

سوئزرلینڈ میں قانون بنانے کے لئے براہِ راست جمہوریت کے بھی حسب ذیل باقیات پائی جاتی ہیں۔

(۱) استشارۂ جمہور۔ (کسی خاص مسئلے میں کل رائے دہندوں سے بلاواسطہ فیصلہ چاہنا)۔ (Referendum) عام طور سے اس سے یہ مراد ہے کہ کوئی قانون جو قانون ساز اسمبلی پاس کردے اس وقت تک مکمل و باضابطہ نہیں سمجھا جاسکتا جب تک کہ ایک مقررہ تعداد جمہور کی اس کے موافق رائے نہ دیدے۔

(۲) (Initiative) شہریوں کا حق قانون سازی (جو مجلس وضع قوانین کے سوا دوسرے شہریوں کو حاصل ہوتا ہے)۔

استشارۂ جمہور حق رد ہے کہ قانون پاس ہو یا نہ ہو لیکن شہریوں کا حق قانون سازی انھیں خود قانون کے تجویز کرنے کا حق دیتا ہے۔

(۳) (The Plebiscite .) رائے عامہ (کسی اہم جمہوری معاملے میں رائے دہندگان کا بلاتوسط نمایندہ رائے دینا) عموماً اس حق کا استعمال کسی ملک کے حصہ کے تبادلے کے موقع پر کیا جاتا ہے۔ ۱۹۳۵ء میں سار کا علاقہ (Saarreigm) جرمنی کو رائے عامہ کی بدولت ملا صوبۂ برار نظام کو اسی کی وجہ سے دیا گیا۔

یہ حق یورپ میں اٹھارویں صدی سے جاری ہے اور مشرق میں بھی بوقت ضرورت اس سے کام لیا گیا ہے۔

ہر مملکت میں قانون ساز مجلسیں علیحدہ علیحدہ ہیں اور ان کی تفصیلات میں پڑنا ان صفحات کا مطلب نہیں۔ یہاں اتنی بات جان لینی ضروری ہے کہ قانون ساز مجلسیں پارٹی بندی پر قائم ہوتی ہیں اور جس پارٹی کو اکثریت حاصل ہوتی ہے وہی وزارت بناتی ہے اور اسی کا ملک پر تسلط ہوتا ہے

اگر تمام دنیا کی جمہوری حکومتوں کے آئین وطرزِ حکومت کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہوجائے گی کہ ان حکومتوں کا مقصد صرف اکثریت کے حقوق کی نگرانی کرنا ہے اور اس اکثریت میں بھی اکثر محض بھیڑ بکریوں کی طرح بڑے بڑے لوگوں کے پیچھے بے سوچے سمجھے چلتے ہیں۔ اور یہی حال نمایندگی کا ہے۔ نمائندہ منتخب کرنے والوں کی نفسیات کا اگر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہوجائے گی کہ یہ نمایندگی ایک فریب کے سوا کچھ نہیں۔

اسلامی حکومت موجودہ زمانہ کی جمہوریت سے بالکل مختلف ہے۔ اگرچہ اس کا نظام اس معنی میں جمہوری نظام ہے کہ شریعت نے امت (Publice) کو پوری پوری آزادی عطا کی ہے کہ وہ اپنی رائے دے سکیں۔ خلیفہ کو منتخب اور معزول کر سکیں اور انصاف کے خلاف کسی حاکم کو قدم نہ اٹھانے دیں۔ حضرت عمرؓ ایسے بارعب خلیفۂ اسلام کے روبرو ایک معمولی حیثیت کے مسلمان تک کو یہ کہنے کی جرأت تھی کہ اگر آپ ذرا راہِ حق سے پھرے تو ہم آپ کو چرخہ کے تکلہ کی طرح سیدھا کردیں گے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحبؒ اسلام کا اقتصادی نظام" میں رقمطراز ہیں۔

"اور جس طرح" امت مسلمہ" پر لزوم جماعت اور اطاعتِ امیر کو ضروری قرار دیا اسی طرح امیر (خلیفہ) پر یہ واجب کیا کہ وہ مہماتِ امور میں اہلِ حل وعقد سے مشورہ کرلے اور حسبِ اقتضاءِ معاملات جمہور سے مشورہ کرنا اپنے اہم فرائض میں سمجھے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرتے ہوئے ارشادِ ربانی ہے"۔

وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ۔ (آل عمران)

اور ان (صحابہؓ) سے مشورہ کرو اور جب کسی بات پر تمہارا عزم قائم ہوجائے تو صرف اللہ پر بھروسہ رکھو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "عزم" سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے" امیر کا اہل الرائے سے مشورہ کرنا اور پھر اس مشورہ پر کاربند ہونا لیا ہے۔

دوسری جگہ قرآن کہتا ہے۔

وامرهم شورى بينهم۔ اور ان کے (مسلمانوں کے) معاملات باہمی مشورے سے طے پاتے ہیں۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قول ہے۔

لاخلافۃ الاعن مشورۃ — خلافت بغیر مشورہ کے خلافت نہیں ہے۔

تاریخِ اسلام شاہد ہے کہ اسلامی حکومت میں خلیفہ اور ایک معمولی انسان میں کوئی فرق نہ تھا اور انصاف کی نگہ میں دونوں شہری بالکل برابر تھے۔ دوسرے یہ کہ ہر قدم پر معاملات مجلس شوریٰ کی رائے سے طے پاتے تھے۔ اگر ہم اسلامی حکومت کی ترکیب اور ساخت پر نظر کریں تو یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اسلامی حکومت کو جمہوریت سے تعبیر کرنا ایک حد تک بجا ہے۔

مولانا شبلی مرحوم الفاروق میں فرماتے ہیں۔

"جمہوری اور شخصی حکومت میں جو چیز سب سے بڑھکر مابہ الامتیاز ہے وہ عوام کی مداخلت اور عدم مداخلت ہے۔ یعنی حکومت میں جس قدر رعایا کو دخل دینے کا زیادہ حق حاصل ہوگا اسی قدر اس میں جمہوریت کا عنصر زیادہ ہوگا۔ یہاں تک کہ سلطنت جمہوری کی اخیر حد یہ ہے کہ مسند نشین حکومت کے ذاتی اختیارات بالکل فنا ہو جائیں اور وہ جماعت کا رکن اور صرف ایک ممبر رہ جائے۔ برخلاف اس کے شخصی سلطنت میں تمام دار و مدار صرف ایک شخص پر ہوتا ہے۔"

حضرت صدیق اکبرؓ کے خطبہ کے مشہور الفاظ ہیں۔

انا بشر ولست بخیر من احدکم	میں تمہاری ہی طرح کا ایک انسان ہوں اور تم میں سے
فراعونی فاذا رأیتمونی استقمت	ایک معمولی فرد سے بھی بہتر نہیں ہوں۔ پس تم میری
فاتبعونی واذا رایتمونی زغت	نگہبانی کرو۔ پس اگر میں راستی اختیار کروں تو میری
فقومونی۔	پیروی کرو اور اگر مجھے کجرو پاؤ تو سیدھا کر دو۔

ان الفاظ کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ اسلام میں شوریٰ کو ایک خاص اہمیت حاصل ہے اور خلیفہ کا مرتبہ ایک شہری سے زیادہ نہیں۔ لیکن مسلمانوں کو یہ نہ سمجھ لینا چاہئے کہ ان کا نظام جمہوریت مکمل ہے۔ اگرچہ نظریات کے اعتبار سے اسلامی قانون بالکل مکمل ہے۔

لیکن عملاً موقع اور محل کے اعتبار سے جزئی تنقیحات اور تشقیقات کی کافی گنجائش ہے۔

(۲) . . Executive) انتظامی۔ انتظامی محکمہ اور انتظامی عمال کی حیثیت حکومت میں بڑی نمایاں ہے۔ غیر جمہوری حکومتوں میں تو انتظامی عمال جو بادشاہ، شاہنشاہ۔ یا ڈکٹیٹر کی صورت میں جلوہ گر ہوتے ہیں۔ سب کچھ ہیں۔ لیکن جمہوری حکومت میں بھی حکومت کا یہ حصہ اس سے کہیں زیادہ کام انجام دیتا ہے۔ جتنا کہ عام طور سے سمجھا جاتا ہے۔ اس کی حیثیت اس صورت سے اور بھی واضح ہو جاتی ہے کہ عموماً لوگ غلطی سے اسی کو حکومت کہتے اور سمجھتے ہیں۔ فائنر (Finer) کے قول کے مطابق۔ انتظامی محکمہ حکومت میں مابقی ترکہ پانے والا (Residnary Legatie) ہے دوسرے دعوے دار مثل شوریٰ اور عدالتوں کے حصہ کے مابعد۔

موجودہ حکومتوں میں نام کے منتظم اور دکھاوٹے کے حاکم بھی برسر اقتدار ہیں اور ان کو حقیقی منتظم اور حکام سے علیحدہ پہچاننا ضروری ہے۔ مثال کے لئے انگلستان میں بادشاہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہے۔ اور اصلی قوت و اختیارات وزیر اعظم اور اس کی وزارت کے ہیں اور یہی دراصل حکومت کے حاکم اور انتظامی محکمہ کے منتظم ہیں

فرانس کے صدر جمہوریہ کو نہ اختیارات حاصل ہیں اور نہ شاہی شان و شوکت صدر جمہوریہ امریکہ کو اگرچہ شاہی شان و شوکت حاصل نہیں مگر اس کو اختیارات حاصل ہیں۔ وہ حقیقی معنی میں حاکم ہے۔ جہاں جہاں یہ نمائشی حکمراں فرماں روا ہیں۔ ان کی حکمرانی دکھاوٹ ہے اگرچہ تمام حکومت ان کے نام سے چلتی ہے اور تمام احکامات ان کے دستخط سے ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کسی حکم پر وزیر کے دستخط نہیں تو وہ حکم محض بے کار ہے۔ اسی طرح وائیمر قانون کی رو سے جرمنی کا صدر بھی محض نام کا صدر تھا اور اس کو حقیقی اختیارات سے دور کا بھی سروکار نہ تھا۔

شوریٰ کا کام قانون بنانا اور انتظامی محکمہ کا کام اس قانون کا نفاذ اور قانون کی تکمیل ہے شوریٰ قانون بنا کر الگ ہو جاتی ہے اور تمام انتظام اسی محکمہ کو کرنے پڑتے ہیں اور اسی لئے یہ "حکومت" کہلائی جاتی ہے۔

اسلامی حاکم نہ انگلستان کی طرح ہے نہ فرانس کی طرح، نہ امریکہ کا صدر ہے، اور نہ سوئزرلینڈ کی کونسل ہے۔ بلکہ وہ خدا کا خلیفہ ہے۔ اور اس کا کام "نیابت الٰہی" اور "خدمتِ خلق" ہے۔

حضرت آدمؑ کے لئے فرمانِ خداوندی ہے۔

انی جاعل فی الارض خلیفہ (بقرہ) میں اپنا زمین میں ایک نائب بنانے والا ہوں۔

اور حضرت داؤدؑ کے لئے ارشاد ربانی ہے۔

یٰداؤدُ انا جعلناک خلیفۃ فی الارض (ص) اے داؤدؑ ہم نے تم کو زمین میں اپنا نائب بنا کر بھیجا ہے

نہ وہ کسی پارٹی کا آدمی ہوتا ہے نہ اس پر کوئی پارٹی حاکم ہوتی ہے، نہ پارٹی کی خاطر سیاست چلاتا ہے بلکہ جمہور کا منتخب کردہ ایک ملازم ہوتا ہے جو خدا کے حکم

"امر بالمعروف ونہی عن المنکر"

پر عمل کرتا ہے اور دیکھتا ہے کہ جمہور، وہی جمہور جس نے اسکو چُنا ہے۔ اس پر عمل کرتی ہے اگر نہیں کرتی تو وہ ان کو سزائیں دیتا ہے۔ اس لئے نہیں کہ جمہور اس کے حکم سے سرتابی کرتی ہے بلکہ اس لئے کہ مجرم خدا کے حکم سے سرتابی کرتا ہے اور خدا کی بتائی ہوئی حد اس پر عائد کرتا ہے۔ اس طرح پر خلیفہ راہ حق کا راہنما بھی ہے اور خدمتِ خلق کا خادم بھی۔ وہ نیابت الٰہی کے منصب سے اگرچہ تمام افراد امت کا والی ہے لیکن اس کے عزل ونصب میں افرادِ امت دخیل وسہیم ہیں اور وہ مہماتِ امور میں "شوریٰ" کا پابند ہے اور اہل الرائے کی مشاورت ہی اس کا عزم ہے [1]

حضرت عمرؓ کے اس خط سے جو آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا تھا خلیفہ کی حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔ آپ تحریر فرماتے ہیں۔

"بلاشبہ رعایا کے اعمال اسی وقت تک "خلیفہ" کی طرف رجوع رہیں گے جب تک امیر خدا کی طرف رجوع رہے گا اور نیابت الٰہی کی ذمہ داری کو ادا کرتا رہے گا"

اولی الامر منکم کی کس قدر واضح تشریح ہے۔

---

[1] اسلام کا اقتصادی نظام از مولانا محمد حفظ الرحمٰن سیوہاروی ص ۸۴۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری امت میں سے اگر کوئی شخص لوگوں کے معاملات کا والی بنا اور اپنے ان کے معاملات کی اس طرح حفاظت نہ کی جس طرح اپنی اور اپنے اہل و عیال کی حفاظت کرتا ہے تو جنت کی بو بھی نہ پا سکے گا۔

(۲) judicial عدالتی۔ ہوسکتا ہے کہ کسی ملک کی مجلس آئین ساز اور محکمۂ انتظامی بہت عمدہ ہو لیکن وہاں ایک آزاد اور غیر جانبدار عدالت نہیں تو اس ملک میں انصاف کی کوئی توقع نہیں۔ اسلام جس کی تمام تر بنیاد انصاف و مساوات ہے۔ اس کے نزدیک کوئی سلطنت و حکومت قیام کے قابل نہیں جب تک وہاں مساوات و انصاف کا پورا پورا انتظام نہ ہو۔ اسلامی مساوات کے نمونۂ تاریخ اسلام میں اس کثرت سے ملتے ہیں کہ دنیا کی تمام تاریخیں مل کر بھی اس سے آدھے واقعات نہیں پیش کر سکتیں۔

غزوۂ بدر میں رحمۃ اللعالمین نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ایک تیر سے مجاہدین کی صفیں ٹھیک کر رہے ہیں۔ سواد بن غزیہؓ صف سے الگ ہیں۔ رحمت اللعالمین چوکا دیکر ان سے صف میں برابر کھڑے ہونے کو فرماتے ہیں۔

فقال یارسول اللہ اوجعتنی وقد	سواد نے کہا یا رسول اللہ آپ نے مجھکو تکلیف دی حالانکہ
بعثك اللہ بالحق والعدل فاقدنی	اللہ نے آپ کو حق و انصاف کے لئے مبعوث کیا ہے پس
فکشف رسول اللہ صلی اللہ علیہ	آپ اجازت دیجئے کہ میں آپ سے بدلہ لوں رسول اللہ
وسلم عن بطنہ فقال استقد	صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً اپنا بطن مبارک کھولدیا اور
قال فاعتنقہ فقبل بطنہ	فرمایا سواد! اپنا بدلہ ضرور لو، سواد فوراً آپ کے گلے سے
[1]	لپٹ گئے اور بطنِ مبارک چوم لیا۔

دونوں جہان کے سردار کی، انصاف پسندی کا اس سے بڑا اور کیا ثبوت ہوگا کہ جس نے حیوانوں کو انسان بنایا۔ جس نے عرب کی قوم کو تمام عالم میں ممتاز بنایا اس قوم کا ایک معمولی فرد

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۳ ص ۲۷۱۔

اسی آقا سے اس طرح گفتگو کرتا ہے کہ آج صدیاں گزرنے کے بعد بھی ہم کو وہ گفتگو ناگوار ہوتی ہے مگر آپ کی شانِ انصاف کہ آپ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی فرد کسی چیز کو ظلم خیال کرتا ہے اور وہ کسی نہ کسی طرح اس عنوان کے تحت آسکتی ہے تو اس کو طلب کرنے اور انصاف چاہنے کا حق حاصل ہے۔ دنیا کی تاریخ اس قسم کا ایک واقعہ بھی نہیں پیش کر سکتی کہ کسی بااختیار انسان سے کسی معمولی فرد کو انصاف چاہنے کا حق اپنے مقابلہ میں دیا ہو، تاریخ شاہد ہے کہ اسلامی تاریخ میں اس قسم کا ایک نہیں سینکڑوں واقعات رونما ہوتے ہیں۔ اسلام کے اندر راعی اور رعیت کے اندر بالکل مساوات رہتی ہے اور یہی انصاف کی بنیاد ہے۔ عدالت کے متعلق حضرت عمرؓ نے جو فرمان جاری کیا تھا وہ حسب ذیل ہے۔

"خدا کی تعریف کے بعد قضا ایک ضروری فرض ہے۔ لوگوں کو اپنے حضور میں اپنے مجلس میں، اپنے انصاف میں برابر رکھو۔ تاکہ کمزور، انصاف سے مایوس نہ ہو اور زور آور کو تمہاری رورعایت کی امید نہ پیدا ہو، جو شخص دعوے کرے اس پر بار ثبوت ہے اور جو شخص منکر ہو اس پر قسم ہے، بشرطیکہ اس سے حرام، حلال، اور حلال، حرام نہ ہونے پائے۔ کل اگر تم نے کوئی فیصلہ کیا تو آج غور کے بعد اس سے رجوع کر سکتے ہو، جس مسئلہ میں شبہ ہو اور قرآن و حدیث میں اس کا ذکر نہ ہو تو اس پر غور کرو اور پھر غور کرو اور اس کی مثالوں اور نظیروں پر خیال کرو پھر قیاس لگاؤ، جو شخص ثبوت پیش کرنا چاہے اس کے لئے ایک میعاد مقرر کرو۔ اگر وہ ثبوت دے تو اس کا حق دلاؤ، ورنہ مقدمہ خارج۔ مسلمان سب ثقہ ہیں، باستثنائے ان اشخاص کے جن کو حد کی سزا میں درے لگائے گئے ہوں یا جنھوں نے جھوٹی گواہی دی ہو، یا ولا اور وراثت میں مشکوک ہوں۔" [1]

اگر آج کل کی عدالتوں پر بحث کی جائے تو اس میں ملکی انتظامی واقعات کا ذکر ناگزیر ہوگا اس لئے وقت کے فرمان کے آگے سر جھکانا مناسب ہے۔ واقعاتِ عالم نظروں کے سامنے ہیں۔

---

[1] الفاروق ص ۴۹ و ۵۰۔

ہر شخص خود انصاف کر سکتا ہے۔ لیکن اتنا کہے بغیر بھی نہیں رہا جاتا کہ مختلف ممالک میں جو گورکدرھندے عدالتی صیغے کے بنائے گئے ہیں وہ سب سینما کی نمود کے سوا کچھ نہیں اور کہیں بھی انصاف ہونا ممکن نہیں۔ اس میں امریکہ و فرانس، انگلستان اور ہندوستان کی کوئی تخصیص نہیں۔

ایں خانہ تمام آفتاب است

جزا اور سزا کے معاملہ کو خدا کے اس حکم پر ختم کیا جاتا جو اس نے اپنے بندوں کے لئے ایک تحفہ کے طور پر پیش کیا ہے اور جس پر عمل کرنے والا دین اور دنیا کی نعمت کا والی بن جاتا ہے۔

وان عاقبتم فعاقبوا	اور (دیکھو) اگر تم بدلہ لو تو چاہئے کہ جتنی اور
بمثل ماعوقبتم بہ	جیسی کچھ برائی تمہارے ساتھ کی گئی اسی کے
ولئن صبرتم لھو	مطابق ٹھیک بدلہ بھی لیا جائے (یہ نہ ہو
خیر اللصّٰبرین۔	کہ زیادتی کر بیٹھو) لیکن اگر تم برداشت کر جاؤ اور
(۱۶ - ۱۲۷)	بدلہ نہ لو (یاد رکھو) برداشت کرنیوالوں کے لئے) برداشت
(ترجمان القرآن ابوالکلام آزاد)	کر جانے میں بہتری ہے۔